حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

دارالعلوم دیوبند اور اس کا مزاج ومذاق

۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ بمطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو نہایت سادگی کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کی عظیم دینی درسگاہ کا آغاز کیا گیا اس درسگاہ کے بانیوں کا مقصد چونکہ دین کی پرخلوص خدمت تھی اس لئے اس کے قیام کیلئے نہ اخبارواشتہار کا اہتمام ہوا نہ اس مقصد کیلئے کوئی باضابطہ بورڈ قائم کیا گیا۔ نہ شہرت اور نام ونمود کے دوسرے طریقے اختیار کئے گئے بس اللہ کے کچھ مخلص بندوں نے دیوبند کے چھوٹے سے قصبہ کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جسے چھتہ کی مسجد کہتے تھے ایک انار کے درخت کے نیچے آب حیات کا یہ چشمہ جاری کردیا، اس عظیم الشان تعلیمی منصوبے کو عملاً شروع کرنے والے صرف دوافراد تھے۔ ایک استاد ایک شاگرد دونوں کا نام محمود تھا، استاد حضرت ملا محمود دیوبندیؒ تھے جنہیں مدرس کی حیثیت میں میرٹھ سے بلایا گیا تھا اور شاگرد دیوبند کے ایک نوجوان محمود الحسن تھے جو بعد میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ کے نام سے معروف ہوئے اور جنہوں نے اپنی ریشمی رومال کی تحریک کے ذریعہ انگریزی حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ ڈال دیا۔ دارالعلوم کی ابتداء ایک انار کے درخت کے سایہ میں ہوتی تھی۔ کسے معلوم تھا کہ یہ دوافراد جو اتنی مسکنت اور گمنامی کے ساتھ یہاں ایک چشمہ فیض جاری کررہے ہیں بالآخر برصغیر کی تاریخ کا رخ موڑ کر رکھ دیں گے لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ اسی سادہ سی درسگاہوں سے علم وفضل کے ایسے ایسے آفتاب ومہتاب پیدا ہوئے جنہوں نے ایک دنیا کو جگمگا کر رکھ دیا۔ درسگاہیں دنیا میں بہت سی قائم ہوئی ہیں، دینی درسگاہوں کا بھی کسی دور میں فقدان نہیں ہوا لیکن اللہ نے دارالعلوم دیوبند کو جو فضیلت اور جو امتیاز بخشا وہ بہت کم علمی اداروں کے حصے میں آتا ہے۔ یہاں مجھے مختصراً اسی امتیاز کو واضح کرنا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض ایک درسگاہ نہیں ایک خاص نظریہ اور ایک خاص طرز عمل کا نام ہے۔ اس درسگاہ کی بنیاد ہی چونکہ اس لئے رکھی گئی تھی کہ اس کے ذریعہ اسلام اور اسلامی علوم کو اپنی صحیح شکل و صورت میں محفوظ رکھا جائے، اس لئے اس کا مسلک یہ رہا ہے کہ دین صرف کتابی حروف ونقوش کا نام نہیں ہے اور نہ دین محض کتابوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اللہ نے ہمیشہ کتاب کے ساتھ رسول کو اس لئے بھیجا ہے کہ وہ اپنے عمل سے کتاب کی تفسیر کرے۔ چنانچہ ایسی مثالیں تو ملتی ہیں کہ دنیا میں رسول بھیجے گئے مگر کتاب نہیں آئی لیکن ایسی مثال کوئی ایک بھی نہیں ہے کہ صرف کتاب بھیج دی گئی ہو

اور اس کے ساتھ رسول کوئی نہ آیاہو۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت بتلاتی ہے کہ دین کو سمجھنے سمجھانے اور پھیلانے پہنچانے کاراستہ صرف کتاب نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ وہ اشخاص بھی ہیں جو کتاب کا عملی پیکر بن کر اس کی تفسیر وتشریح کرتے ہیں لہذا دین کو سمجھنے کیلئے کتاب اللہ اور رجال اللہ، لازم ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ قرآن کریم کو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر وتشریح کی روشنی میں اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ وتابعین اور دوسرے بزرگان دین کے متواتر عمل کی روشنی میں ہی ٹھیک سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کے بغیر دین کی تعبیر وتشریح کی ہر کوشش گمراہی کی طرف جاتی ہے۔ ہاں دین کے ان سرچشموں میں مراتب کا فرق ضرور ہے جو مقام اللہ تعالیٰ کا ہے وہ کسی نبی کو حاصل نہیں ہوسکتا، جو مرتبہ ایک نبی کا ہے وہ کسی صحابی کو نہیں مل سکتا اور جو درجہ ایک صحابی کو حاصل ہے کوئی بڑے سے بڑا ولی اس درجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ بس فرق مراتب کے ساتھ دین کے ان سرچشموں میں سے ہر ایک کے حقوق وحدود کی رعایت دارالعلوم دیوبند کا وہ خصوصی مزاج ہے جس نے اسے دوسرے اداروں سے امتیاز عطاکیا ہے اور جس کی بناپر اس کا مسلک مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کے درمیان ایک ایسی راہ اعتدال کی حیثیت رکھتا ہے جو افراط وتفریط سے بچتی ہوئی کتاب وسنت تک پہنچتی ہے۔

اور جب دارالعلوم دیوبند کا اساسی نظریہ یہ ٹھہرا کہ دین کتاب اللہ اور رجال اللہ کے مجموعہ کا نام ہے تو یہیں سے اس کا ایک دوسرا عملی امتیاز ظاہر ہوتا ہے اور وہ یہ کہ دارالعلوم اپنے عہد شباب میں محض ایک علمی درسگاہ نہیں تھی جس میں طلباء کو صرف کتابوں کے حروف ونقوش اور صرف علم کا ظاہری خول دیاجاتاہو بلکہ ساتھ ساتھ ایک عملی تربیت گاہ بھی تھی جہاں علم کے ظاہری بدن میں عمل صالح اور اخلاق فاضلہ کی روح بھری جاتی تھی، یہاں سے فارغ ہوکر نکلنے والے صرف ظاہری علوم ہی سے آراستہ نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ عملی اختیار سے بھی سچے اور پکے مسلمان ہوتے تھے جنکی ہر ہر نقل وحرکت اسلام کی نمائندگی کرتی تھی۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد یسین صاحبؒ دارالعلوم کے قرن اول کے طلباء میں سے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے دارالعلوم کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب اسکے ایک چپراسی سے لیکر صدر مدرس اور مہتمم تک ہر ہر شخص ولی کامل تھا۔ دن کے وقت یہاں علوم وفنون کے چرچے ہوتے اور رات کے وقت اسکا گوشہ گوشہ اللہ کے ذکر اور تلاوت قرآن پاک سے گونجتا تھا۔ چنانچہ اس دور میں جو شخصیتیں دارالعلوم دیوبند سے تیار ہوئیں انہوں نے عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، سیاست اور اجتماعی امور میں ایسے ایسے تابناک کردار پیش کئے ہیں کہ آج اس کی نظیر ملنا مشکل ہے، ان میں سے ہر شخص اسلام کی مجسم تبلیغ تھا، وہ جہاں بیٹھ گیا، ایک جہاں

کو سچا مسلمان بناکر اٹھا۔ علم اگر روح عمل سے خالی ہو تو عموماً انسان میں خود پسندی اور پندار پیدا کردیتا ہے۔ لیکن دارالعلوم دیوبند کا علم چونکہ روکھا پھیکا علم نہ تھا، بلکہ اس میں اخلاق و عمل اور عشق و محبت کا سوزوساز بھی شامل تھا۔ اس لئے اس کی تیسری خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس کا پورا ماحول تواضع اور سادگی اور بے تکلفی کا ماحول تھا۔ وہاں ہر شخص علم و عمل کا آفتاب ہونے کے باوجود عبدیت اور تواضع کا پیکر تھا اس جماعت کے افراد ایک طرف علمی وقار استغناء اور خودداری کے حامل تھے اور دوسری طرف فروتنی، خاکساری اور ایثار وزہد کے جذبات سے معمور۔ دارالعلوم کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ ہر علم وفن سے یکتائے روزگار تھے، ان کی تصانیف آج بھی ان کے علوم کی شاہد ہیں، لیکن سادگی کا عالم یہ تھا کہ ان کے پاس کبھی کپڑوں کے دو سے زائد جوڑے جمع نہیں ہوئے دیکھنے والا پتہ بھی نہ لگاسکتا تھا کہ یہ وہی مولانا محمد قاسمؒ ہیں، جنہوں نے مسلمانوں ہی سے نہیں غیر مسلموں اور مخالفوں سے بھی اپنے علم وفضل کا لوہا منوایا ہے۔ حضرت مولانا سید احمد دہلویؒ دارالعلوم کے قرن اول کے اساتذہ میں سے تھے اور فلسفہ، ریاضی ہئیت اور دیگر عقلی علوم میں اس وقت ان کا ثانی نہیں تھا، انہوں نے ساری عمر دیوبند کے قصبہ میں گذاری اور اس حالت میں دنیا سے تشریف لے گئے کہ دیوبند میں ان کی ذاتی جائیداد تو کجا رہنے کا امکان بھی اپنا نہیں تھا۔ تعظیمی القاب کے تکلفات تو بہت بعد میں پیدا ہوئے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ جو دارالعلوم کے پہلے طالبعلم تھے اور بعد میں علم وسیاست دونوں میدانوں میں عالمگیر شہرت حاصل کی جب وہ دارالعلوم کے صدر مدرس ہوئے تو انہیں صرف "بڑے مولوی صاحب" کہا جاتا تھا۔ مفتی عزیز الرحمان صاحب دارالعلوم کے مفتی اعظم تھے لیکن مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ وہ محلے کی بیواؤں، یتیموں اور بیکس افراد کا سودا سلف خود اپنے ہاتھوں سے لاکر انہیں پہنچایا کرتے تھے۔ حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ (جو حضرت میاں صاحب کے نام سے معروف ہیں) حدیث کے اونچے درجہ کے اساتذہ میں تھے۔ لیکن آخر عمر تک ایک کچے مکان میں مقیم رہے اور صرف اسلئے پختہ مکان نہیں بنوایا کہ محلہ غریبوں کا تھا اور جبتک سب کے مکان پختہ نہ بن جائیں اپنا مکان پکا کرانے کو دل نہیں مانتا تھا۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ جنہیں آج دنیا اس صدی کے عظیم رہنما کی حیثیت سے جانتی ہے اور جنہوں نے ایک ہزار سے زیادہ تصانیف چھوڑی ہیں ایک امیر گھرانہ کے چشم وچراغ تھے، لیکن دارالعلوم میں طالب علمی ہی کے زمانے میں اوقات کے نظم وضبط کا عالم یہ تھا کہ انکی مصروفیات کو دیکھ کر وقت معلوم کیا جاسکتا تھا، زمانہ امتحان کا ہو یا عام تعلیم کا ہمیشہ عشاء کے بعد سوجاتے اور آخر شب میں تہجد کیلئے بیدار ہوتے۔ اس معمول میں کبھی فرق

نہیں آیا۔اس علمی ادارے کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے مسلک اعتدال کی طرف دعوت اور دوسروں پر تنقید کے سلسلے میں پیغمبرانہ اسلوب تبلیغ اختیار کیا جس میں مخالف کو زیر کرنے کے بجائے اسکی دینی خیرخواہی کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے ۔ دارالعلوم دیوبند نے حق کے معاملے میں مداہنت کو کبھی گوارا نہیں کیا اور جس بات کو حق سمجھا اس کا برملا اظہار کیا لیکن اس اظہار میں حکمت اور نرمی کا پہلو ہمیشہ مدنظر رکھا گیا۔دارالعلوم دیوبند کا اصل مقصد چونکہ دین کی حفاظت تھا اور یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہ ہوسکتا تھا جبتک ایک جماعت دوسرے ہر کام کو چھوڑکر صرف اسی کی نہ ہورہے اسلئے انہوں نے دنیوی مناصب اور عہدوں سے قطع نظرکر کے خود پیٹ پر پتھرباندھ کر اس خدمت کو انجام دیا، لیکن عام مسلمانوں کی مادی ترقی کی فکر انہیں ہمیشہ دامن گیر رہی اور انہوں نے ہراس پرخلوص تحریک کے ساتھ مقدور بھرتعاون کیا جو دین کو محفوظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کی اجتماعی فلاح اور مادی ترقی کا مقصد لےکر آگے بڑھی، ہاں جس کی جگہ مادی ترقی کے شوق میں انہیں دین پامال ہوتا نظرآیا وہاں وہ دین کی حفاظت کیلئے سد سکندری بن گئے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ دوسوسال تک انگریز اور ہندو کی دوہری چکی میں پسنے کے باوجود اللہ کے فضل وکرم آج دین اپنی صحیح شکل میں محفوظ ہے ۔ برصغیر میں دین کو سمجھانے والے اسکی دعوت دینے والے اور اس پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ رکھنے والے موجود ہیں اور عام مسلمان بھی مغربی افکار کے بےپناہ سیلاب کے باوجود نظری طور پر آج بھی مسلمان ہیں اور اسلام پر فخرکرتے ہیں ۔

دارالعلوم دیوبند نے جتنی عظیم شخصیتیں پیدا کیں اتنی شخصیتیں کم ہی کسی علمی درسگاہ کے حصے میں آتی ہیں ۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمودالحسن صاحبؒ حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ، حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمن صاحبؒ، حضرت مولاناشبیراحمد عثمانی صاحبؒ، حضرت مولانا مناظراحسن گیلانیؒ اور نہ جانے علم وعمل کے کیسے کیسے آفتاب و مہتاب اس درسگاہ سے پیدا ہوئے جن میں سے ہر شخص ایک مستقل جماعت کی حیثیت رکھتا تھا ۔ دارالعلوم دیوبند درحقیقت انہی شخصیتوں اور اسی طرزفکر اور طرز عمل کا نام ہے جسکی مختصر تشریح اوپر پیش کی گئی ۔ میں نے اپنی آنکھ دارالعلوم دیوبند ہی کے پرنور صحن میں کھولی اور ترپن (۵۳) سال اس مادر علمی کی آغوش میں گذارے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اسکے انوار وفیوض کا ہر شعبہ ایک ضخیم تصنیف چاہتا ہے اوہ آج جب کوئی شخص مجھ سے یہ پوچھتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کس چیز کا نام ہے ؟ اور اسکے امتیازی خصائص کیا ہیں ؟ تو میں اس شعر کے سوا ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دے پاتا کہ:

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں　　　بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد ؟

جناب ڈاکٹر نثار محمد صاحب
شعبہ علوم دینیہ اسلامیہ کالج پشاور

مسلمانوں کی طبّی خدمات

طب عربی زبان کا لفظ ہے اور اسکے معنی ہیں جھاڑ پھونک اور ٹونے ٹوٹکے وغیرہ (۱) حدیث شریف میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک حدیث میں " رجل مطبوب" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں ایک ایسا شخص جس پر جادو کا اثر ہوا ہو (۲) چونکہ یہ علم ابتدا میں جھاڑ پھونک اور مذہبی اعتقادات ونظریات پر مبنی تصورات سے شروع ہوا۔ اس لئے اس کے لئے طب کا لفظ استعمال کیا جانے لگا۔ طب پر زمانہ قدیم سے مذہب کا اثر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں طب اور مذہب کا تعلق برقرار رہا اور آج کے اس جدید طبی دور میں بھی لوگ علاج کے لئے مذہب ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ طب جس جدید شکل میں آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کو یہاں تک پہنچانے میں بے شمار طبی ماہرین کی کاوشیں شامل ہیں۔ ان میں سے بعض کے نام تو تاریخ کی کتابوں میں مرقوم ہیں۔ اور بعض کے ناموں سے بھی لوگ واقف نہیں ہیں۔ (۳)۔

طب کا سفر انسان کے ساتھ کب شروع ہوا؟ اس کی کوئی قابل اعتماد شہادت نہیں ملتی۔ تاہم اتنی بات ضرور ہے کہ جب سے اس کرہ ارض پر انسانی زندگی کا آغاز ہوا۔ تب سے طب کا سفر بھی اس کے ساتھ شروع ہوا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ طب کا آغاز بابل اور نینوا نامی شہروں سے بھی پہلے تقریباً پانچ ہزار قبل مسیح میں ہوا تھا۔ (۴)۔ قدیم طب میں کسی بھی بیماری کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ یہ بیماری اس انسان کے کسی گناہ کی وجہ سے اس پر نازل ہوئی ہے۔ (۵)۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ناقابل علاج بیماریاں کسی ماورائی طاقت (VITAL FORCE) کے غیض وغضب کا نتیجہ ہے۔ اور اس کا علاج بھی وہی بالائی طاقت (دیوی دیوتا وغیرہ) ہی کر سکتی ہے۔ (۶)۔ تمام قدیم تہذیبوں (مصری، چینی، رومی، ہندی اور یونانی) میں ایک بات قدر مشترک تھی کہ ان سب نے بیماری کو انسان کی اندر کے کسی جسمانی خرابی کے طور پر تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ کسی ماورائی طاقت کے غیض وغضب کی کارستانی قرار دیا تھا۔ اور یہ کہ اسکا علاج بھی اسی طاقت کے ذریعے ممکن ہے۔